© rasailojaraid.com

احترام کا حکم ضرور قرآن میں دیا گیا ہے مگر یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اے مسلمانو تم اپنی ہر بستی میں مسجد تعمیر کرو اور اس میں ہمیشہ نماز با جماعت قائم کرنے کا اہتمام کرو۔ یہ ساری چیزیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس اختیار و اقتدار کی بنا پر جس کے ساتھ اللہ نے آپ کو شارع مقرر کیا تھا، مسلمانوں میں رائج کی ہیں۔ اگر یہ اختیار و اقتدار مسلّم نہ ہوتا تو اسلام کے یہ نمایاں ترین شعائر، جن کا مسلمانوں کو مجتمع کرنے اور ایک یک رنگ امت بنانے اور اسلامی تہذیب کی صورت گری کرنے میں سب سے زیادہ حصّہ ہے کبھی قائم نہ ہوتے اور مسلمان آج مسیحیوں سے بھی زیادہ منتشر و پراگندہ ہوتے۔

یہ صرف سامنے کی چند مثالیں ہیں۔ ورنہ تفصیل کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ اگر ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف ایک کتاب ہی ملی ہوتی اور اس کے ساتھ اللہ کے رسولؐ نے آکر انفرادی زندگی سے لیکر خاندان، معاشرے اور ریاست تک کے معاملات میں ہمارے لیے تہذیب کی ایک متعین صورت نہ بنا دی ہوتی تو آج ہم ایک ممتاز عالمگیر ملّت واحدہ کی حیثیت سے موجود نہ ہوتے۔ اب جو شخص اس رسالت کی شرعی حیثیت اور اس کی قانونی سند کو چیلنج کرتا ہے اس کے اس چیلنج کی زد ایک قربانی کے مسئلے یا دو چار منفرد مسئلوں پر نہیں پڑتی، بلکہ اسلامی تہذیب کے پورے نظام اور ملّتِ اسلامیہ کی اساس و بنیاد پر پڑتی ہے۔ جب تک ہم بالکل خودکشی پر آمادہ نہ ہو جائیں ہمارے لیے کسی کی یہ بات ماننا محال ہے کہ جس چیز کی سند قرآن میں ملے بس وہی باقی رہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند پر جتنی چیزوں کا مدار ہے وہ سب ساقط کر دی جائیں۔

اعتراض کی اس غلط بنیاد اور اس کے خطرناک نتائج کو سمجھ لینے کے بعد اب بجائے خود اس مسئلے کو دیکھیے جس پر اعتراض کیا جا رہا ہے۔ قربانی کے متعلق یہ کہنا کہ قرآن میں سرے سے اس کا کوئی حکم ہی نہیں ہے، خلافِ واقعہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن وہ اصولی حقائق بیان کرتا ہے جن کی بنا پر انسان کو اللہ تعالیٰ کے لیے جانوروں کی قربانی کرنی چاہیے، اور پھر اس کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک عام حکم دے کر چھوڑ دیتا ہے۔ اس حکم پر عمل درآمد کیسے کیا جائے، اس کی کوئی تصریح وہ نہیں کرتا۔ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ آپ اُسی خدا کی ہدایت کے تحت جس نے قرآن آپ پر نازل کیا تھا، اس کی عملی صورت، اس کا وقت، اس کی جگہ اور اس کے ادا کرنے کا صحیح طریقہ مسلمانوں کو بتائیں اور خود اس پر عمل کر کے دکھائیں۔ یہ کام تنہا ایک قربانی کے متعلق ہی نہیں، قرآن کے دوسرے احکام کے متعلق بھی حضور نے کیا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، وراثت، غرض مسلم معاشرے کے مذہب اور تمدن و معاشرت اور معیشت و سیاست اور قانون و عدالت اور صلح و جنگ کے تمام معاملات میں یہی کچھ ہوا ہے کہ قرآن نے کسی کے بارے میں مختصر اور کسی کے بارے میں کچھ تفصیل کے ساتھ احکام دیئے، یا صرف اشارۃً اللہ تعالیٰ کی مرضی بیان کر دی، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عملی جامہ پہنانے کی صورتیں واضح حدود کے ساتھ متعین فرمائیں، ان پر خود کام کر کے دکھایا، اور اپنی رہنمائی میں ان کو رائج کیا۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی اس میں شک نہیں کر سکتا کہ کتابی رہنمائی کے ساتھ یہ عملی رہنمائی بھی انسانوں کو درکار تھی، اور اس رہنمائی کے لیے اللہ کے رسول کے سوا کوئی دوسرا نہ موزوں ہو سکتا تھا نہ مجاز۔

قرآن میں اس مسئلے کے متعلق جو اصولی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) عبادت کی تمام وہ صورتیں جو انسان نے غیر اللہ کے لیے اختیار کی ہیں، دینِ حق میں وہ سب غیر اللہ کے لیے حرام اور خالصتہً اللہ تعالیٰ کے لیے واجب کر دی گئیں۔ مثلاً انسان غیر اللہ کے آگے جھکتا اور سجدے کرتا تھا۔ دینِ حق نے اسے اللہ کے لیے مخصوص کر دیا اور اس کے لیے نماز کی صورت مقرر کر دی۔ انسان غیر اللہ کے سامنے مالی نذرانے پیش کرتا تھا۔ دینِ حق نے اسے اللہ کے لیے خاص کر دیا اور اس کی عملی صورت زکوٰۃ مقرر کر دی۔ انسان غیر اللہ کے نام پر روزے رکھتا تھا۔ دینِ حق نے اسے بھی اللہ کے لیے مختص کر دیا (باقی صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفہیم القرآن

النمل

نام | دوسرے رکوع کی چوتھی آیت میں وَادِ النَّمْل کا ذکر آیا ہے۔ سورہ کا نام اسی سے ماخوذ ہے یعنی وہ سورۃ جس میں النمل کا قصہ مذکور ہے۔ یا جس میں النمل کا لفظ وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نزول | مضمون اور انداز بیان مکہ کے دورِ متوسط کی سورتوں سے پوری مشابہت رکھتا ہے۔ اور اس کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے۔ ابن عباسؓ اور جابر بن زیدؒ کا بیان ہے کہ "پہلے سورۂ شعراء نازل ہوئی، پھر النمل، پھر القصص"۔

موضوع اور مباحث | یہ سورۃ دو خطبوں پر مشتمل ہے۔ پہلا خطبہ آغاز سورہ سے چوتھے رکوع کے خاتمے تک ہے۔ اور دوسرا خطبہ پانچویں رکوع کی ابتدا سے سورۃ کے اختتام تک۔

پہلے خطبے میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رہنمائی سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس کی بشارتوں کے مستحق بھی صرف وہی لوگ ہیں جو اُن حقیقتوں کو تسلیم کریں جنہیں یہ کتاب اس کائنات کی بنیادی حقیقتوں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور پھر مان لینے کے بعد اپنی عملی زندگی میں بھی اطاعت و اتباع کا رویہ اختیار کریں۔ لیکن اس راہ پر آنے اور چلنے میں جو چیز سب سے بڑھ کر مانع ہوتی ہے وہ انکارِ آخرت ہے، کیونکہ یہ آدمی کو غیر ذمہ دار، بندۂ نفس اور فریفتۂ حیاتِ دنیا بنا دیتا ہے، جس کے بعد آدمی کا خدا کے آگے جھکنا اور اپنے نفس کی خواہشات پر اخلاقی پابندیاں برداشت کرنا ممکن نہیں رہتا۔

اس تمہید کے بعد تین قسم کی سیرتوں کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

ایک نمونہ فرعون اور سردارانِ قومِ ثمود اور سرکشانِ قومِ لوطؑ کا ہے جن کی سیرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکرِ آخرت سے بے نیازی اور نتیجۃً نفس کی بندگی سے تعمیر ہوئی تھی۔ یہ لوگ کسی نشانی کو دیکھ کر بھی ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ یہ اُلٹے ان لوگوں کے دشمن ہو گئے جنہوں نے ان کو خیر وصلاح کی طرف بلایا۔ انہوں نے اپنی اُن بدکاریوں پر بھی پورا اصرار کیا جن کا گھناؤنا پن کسی صاحبِ عقل انسان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انہیں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے سے ایک لمحہ پہلے بھی ہوش نہ آیا۔

دوسرا نمونہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے جن کو خدا نے دولت، حکومت، اور شوکت وحشمت سے اس پیمانے پر نوازا تھا کہ کفارِ مکہ کے سردار اس کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اس سب کے باوجود چونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کے حضور جواب دہ سمجھتے تھے، اور انہیں احساس تھا کہ انہیں جو کچھ بھی حاصل ہے خدا کی عطا سے حاصل ہے، اس لیے ان کا سر ہر وقت منعمِ حقیقی کے آگے جھکا رہتا تھا اور کبرِ نفس کا کوئی ادنیٰ شائبہ تک ان کی سیرت وکردار میں نہ پایا جاتا تھا۔

تیسرا نمونہ ملکۂ سبا کا ہے جو تاریخِ عرب کی نہایت مشہور دولت مند قوم پر حکمراں تھی۔ اس کے پاس تمام وہ اسباب جمع تھے جو کسی انسان کو غرورِ نفس میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ جن چیزوں کے بل پر کوئی انسان گھمنڈ کر سکتا ہے وہ سردارانِ قریش کی بہ نسبت لاکھوں درجے زیادہ اسے حاصل تھیں۔ پھر وہ ایک مشرک قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ تقلیدِ آبائی کی بنا پر بھی، اور اپنی قوم میں اپنی سرداری برقرار رکھنے کی خاطر بھی، اس کے لیے دینِ شرک کو چھوڑ کر دینِ توحید اختیار کرنا اس سے بہت زیادہ مشکل تھا جتنا کسی عام مشرک کے لیے ہو سکتا ہے۔ لیکن جب اس پر حق واضح ہو گیا تو کوئی چیز اسے قبولِ حق سے نہ روک سکی، کیونکہ اس کی گمراہی محض ایک مشرک ماحول میں آنکھیں کھولنے کی وجہ سے تھی۔ نفس کی بندگی اور خواہشات کی غلامی کا مرض اس پر مسلط نہ تھا۔ خدا کے حضور جوابدہی کے احساس سے اس کا ضمیر فارغ نہ تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے خطبے میں سب سے پہلے کائنات کے چند نمایاں ترین مشہود حقائق کی طرف اشارے کر کے کفارِ مکہ سے پے در پے سوال کیا گیا ہے کہ بتاؤ، یہ حقائق اس شرک کی شہادت دے رہے ہیں جس میں تم مبتلا ہو، یا اُس توحید پر گواہ ہیں جس کی دعوت اِس قرآن میں تمہیں دی جارہی ہے؟ اس کے بعد کفار کے اصل مرض پر انگلی رکھ دی گئی ہے کہ جس چیز نے ان کو اندھا بنا رکھا ہے، جس کی وجہ سے وہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھتے اور سب کچھ سُن کر بھی کچھ نہیں سنتے وہ دراصل آخرت کا انکار ہے۔ اسی چیز نے ان کے لیے زندگی کے کسی مسئلے میں بھی کوئی سنجیدگی باقی نہیں چھوڑی ہے، کیونکہ جب ان کے نزدیک آخر کار سب کچھ مٹی ہو جانا ہے، اور حیاتِ دنیا کی اس ساری تگ و دو کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے تو آدمی کے لیے پھر حق اور باطل سب یکساں ہیں۔ اس کے لیے اس سوال میں سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی کہ اس کا نظامِ حیات راستی پر قائم ہے یا ناراستی پر۔

لیکن اس بحث سے مقصود یاس نہیں ہے کہ جب یہ لوگ غفلت میں مگن ہیں تو انہیں دعوت دینا بے کار ہے۔ بلکہ دراصل اس سے مقصود سونے والوں کو جھنجوڑ کر جگانا ہے۔ اس لیے چھٹے اور ساتویں رکوع میں پے در پے وہ باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جو لوگوں میں آخرت کا احساس بیدار کریں، اس سے غفلت کے نتائج پر متنبہ کریں، اور انہیں اس کی آمد کا اس طرح یقین دلائیں جس طرح ایک آدمی اپنی آنکھوں دیکھی بات کا اُس شخص کو یقین دلاتا ہے جس نے اسے نہیں دیکھا ہے۔

خاتمۂ کلام میں قرآن کی اصل دعوت، یعنی خدائے واحد کی بندگی کی دعوت، نہایت مختصر، مگر انتہائی مؤثر انداز میں پیش کر کے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اسے قبول کرنا تمہارے اپنے لیے نافع اور اسے رد کرنا تمہارے اپنے لیے ہی نقصان دہ ہے۔ اسے ماننے کے لیے اگر خدا کی وہ نشانیاں دیکھنے کا انتظار کرو گے جن کے سامنے آجانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بعد ماننے بغیر چارہ نہ رہے گا، تو یاد رکھو کہ وہ فیصلے کا وقت ہوگا، اس وقت ماننے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

طٰسٓ۔ یہ آیات ہیں قرآن اور کتابِ مبین[1] کی، ہدایت اور بشارت[2] ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں[3] اور وہ ایسے لوگ ہیں جو آخرت کا یقین رکھتے

---

[1] "کتابِ مبین" کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی تعلیمات اور اپنے احکام اور ہدایات کو بالکل واضح طریقے سے بیان کرتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ وہ حق اور باطل کا فرق نمایاں طریقے سے کھول دیتی ہے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کا کتابِ الٰہی ہونا ظاہر ہے، جو کوئی اسے آنکھیں کھول کر پڑھے گا اس پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا گھڑا ہوا کلام نہیں ہے۔

[2] یعنی یہ آیات ہدایت اور بشارت ہیں۔ "ہدایت کرنے والی" اور "بشارت دینے والی" کہنے کے بجائے انہیں بجائے خود "ہدایت اور بشارت" کہا گیا جس سے رہنمائی اور بشارت کے وصف میں ان کے کمال کا اظہار مقصود ہے، جیسے کسی کو آپ سخی کہنے کے بجائے مجسم سخاوت اور حسین کہنے کے بجائے سراپا حسن کہیں۔

[3] یعنی قرآن مجید کی یہ آیات رہنمائی بھی صرف انہی لوگوں کی کرتی ہیں اور انجام نیک کی خوشخبری بھی صرف انہی لوگوں کو دیتی ہیں جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کریں، خدائے واحد کو اپنا ایک ہی الٰہ اور رب مان لیں، قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کریں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق مان کر اپنا پیشوا بنا لیں، اور یہ عقیدہ بھی اختیار کرلیں کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں ہم کو اپنے اعمال کا حساب دینا اور جزائے اعمال سے دوچار ہونا ہے۔ پھر ان چیزوں کو محض مان کر نہ رہ جائیں بلکہ عملاً اتباع و اطاعت کے لیے تیار ہوں جس کی اولین علامت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہ دونوں شرطیں جو لوگ پوری کر دیں گے انہی کو قرآن کی آیات دنیا میں زندگی کا سیدھا راستہ بتائیں گی، اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ ۹ــ برعکس اس کے، جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے لیے درحقیقت ہم نے اُن کے کرتوتوں

راستہ کے ہر مرحلے میں ان کو صحیح اور غلط کا فرق سجھائیں گی، اس کے ہر موڑ پر انہیں غلط راہوں کی طرف جانے سے بچائیں گی، اور ان کو یہ اطمینان بخشیں گی کہ راست روی کے نتائج دنیا میں خواہ کچھ بھی ہوں، آخر کار ابدی اور دائمی فلاح اسی کی بدولت انہیں حاصل ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے سرفراز ہونگے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک معلم کی تعلیم سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اس پر اعتماد کر کے واقعی اس کی شاگردی قبول کرے اور اس کی ہدایات کے مطابق کام بھی کرے۔ ایک ڈاکٹر سے استفادہ وہی مریض کر سکتا ہے جو اسے اپنا معالج بنائے اور دوا اور پرہیز وغیرہ کے معاملہ میں اس کی ہدایات پر عمل کرے۔ اسی صورت میں معلم اور ڈاکٹر یہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ آدمی کو نتائج مطلوبہ حاصل ہونگے۔

بعض لوگوں نے اس آیت میں يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ اخلاق کی پاکیزگی اختیار کریں۔ لیکن قرآن مجید میں اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ایتاءِ زکوٰۃ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے، اس سے مراد وہ زکوٰۃ ادا کرنا ہے جو نماز کے ساتھ اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ علاوہ بریں زکوٰۃ کے لیے ایتاء کا لفظ استعمال ہوا ہے جو زکوٰۃِ مال ادا کرنے کے معنی متعین کر دیتا ہے، کیونکہ عربی زبان میں پاکیزگی اختیار کرنے کے لیے تزکّی کا لفظ بولا جاتا ہے نہ کہ ایتاءِ زکوٰۃ۔ دراصل یہاں جو بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ کہ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایمان کے ساتھ عملاً اطاعت و اتباع کا رویہ اختیار کرنا بھی ضروری ہے اور اقامتِ صلوٰۃ و ایتاءِ زکوٰۃ وہ پہلی علامت ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ آدمی نے واقعی اطاعت قبول کرلی ہے۔ یہ علامت جہاں غائب ہوئی وہاں فوراً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی سرکش ہے، حاکم کو حاکم چاہے اس نے مان لیا ہو، مگر حکم کی پیروی کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔

۱۰ــ اگرچہ آخرت کا عقیدہ ایمانیات میں شامل ہے اور اس بنا پر "ایمان لانے والوں" سے مراد ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہیں جو توحید اور رسالت کے ساتھ آخرت پر بھی ایمان لائیں، لیکن ایمانیات کے ضمن میں اس کے آپ سے آپ شامل ہونے کے باوجود یہاں اس عقیدے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے خاص طور پر زور دے کر اسے الگ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو خوشنما بنا دیا ہے، اس لیے وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۵۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بری سزا ہے۶ اور

لوگ آخرت کے قائل نہ ہوں ان کے لیے اس قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا بلکہ اس پر قدم رکھنا بھی محال ہے۔ کیونکہ اس طرزِ فکر کے لوگ طبعاً اپنا معیارِ خیر و شر صرف اُنہی نتائج سے متعین کرتے ہیں جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے یا ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے لیے کسی ایسی نصیحت و ہدایت کو قبول کرنا ممکن نہیں ہوتا جو انجامِ اُخروی کو سود و زیاں اور نفع و نقصان کا معیار قرار دے کر خیر و شر کا تعین کرتی ہو۔ ایسے لوگ اوّل تو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم پر کان ہی نہیں دھرتے، لیکن اگر کسی وجہ سے وہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو بھی جائیں تو آخرت کا یقین نہ ہونے کے باعث ان کے لیے ایمان و اسلام کے راستے پر ایک قدم چلنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس راہ میں پہلی ہی آزمائش جب پیش آئے گی، جہاں دنیوی فائدے اور اُخروی نقصان کے تقاضے انہیں دو مختلف سمتوں میں کھینچیں گے تو وہ بے تکلف دنیا کے فائدے کی طرف کھنچ جائیں گے اور آخرت کے نقصان کی ذرہ برابر پروا نہ کریں گے، خواہ زبان سے وہ ایمان کے کتنے ہی دعوے کرتے رہیں۔

۵ؔ یعنی خدا کا قانونِ فطرت یہ ہے، نفسیاتِ انسانی کی فطری منطق یہی ہے کہ جب آدمی زندگی اور اس کی سعی و عمل کے نتائج کو صرف اسی دنیا تک محدود سمجھے گا، جب وہ کسی ایسی عدالت کا قائل نہ ہو گا جہاں انسان کے پورے کارنامۂ حیات کی جانچ پڑتال کر کے اس کے حسن و قبح کا آخری اور قطعی فیصلہ کیا جانے والا ہو، اور جب وہ موت کے بعد کسی ایسی زندگی کا قائل نہ ہو گا جس میں حیاتِ دنیا کے اعمال کی حقیقی قدر و قیمت کے مطابق ٹھیک ٹھیک جزا و سزا دی جانے والی ہو، تو لازماً اس کے اندر ایک مادہ پرستانہ نقطۂ نظر نشوونما پائے گا۔ اسے حق اور باطل، شرک اور توحید، نیکی اور بدی، اخلاق اور بد اخلاقی کی ساری بحثیں سراسر بے معنی نظر آئیں گی۔ جو کچھ اسے اس دنیا میں لذت و عیش اور مادّی ترقی و خوشحالی اور قوت و اقتدار سے ہمکنار کرے وہی اس کے نزدیک بھلائی ہو گی قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی فلسفۂ حیات اور کوئی طرزِ زندگی اور نظامِ اخلاق ہو۔ اس کو حقیقت اور صداقت سے دراصل کوئی غرض ہی نہ ہو گی۔ اس کی اصل مطلوب صرف حیاتِ دنیا کی زینتیں اور کامرانیاں ہوں گی جن کے حصول کی فکر اسے ہر وادی میں لیے بھٹکتی پھرے گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے ہیں۔ اور (اے محمدؐ) بلاشبہ تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو۔[۵]

(انہیں اُس وقت کا قصہ سناؤ) جب موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا[۶]

اور اس مقصد کے لیے جو کچھ بھی وہ کرے گا اسے اپنے نزدیک بڑی خوبی کی بات سمجھے گا اور اُلٹا اُن لوگوں کو بے وقوف سمجھے گا جو اس کی طرح دنیا طلبی میں منہمک نہیں ہیں اور اخلاق و بداخلاقی سے بے نیاز ہو کر ہر کام کر گزرنے میں بیباک نہیں ہیں۔

کسی کے اعمالِ بد کو اس کے لیے خوشنما بنا دینے کا یہ فعل قرآن مجید میں کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کبھی شیطان کی طرف۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے تو اس سے مراد، جیسا کہ اوپر بیان ہُوا، یہ ہوتی ہے کہ فطرۃ اللہ کے مطابق جو شخص یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے اسے زندگی کا یہ ہنجار خود بخود ہی محسوس ہُوا ہے۔ اور جب وہ شیطان کی طرف منسوب ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو اختیار کر لینے والے آدمی کے سامنے شیطان ہر وقت ایک خیالی جنت پیش کرتا رہتا ہے اور اسے خوب اطمینان دلاتا ہے کہ شاباش برخوردار، بہت اچھے جا رہے ہو۔

[۴] اس بری سزا کی صورت، وقت اور جگہ کا تعین نہیں کیا گیا ہے کیونکہ یہ اس دنیا میں بھی مختلف افراد گروہوں اور قوموں کو بے شمار مختلف طریقوں سے ملتی ہے، اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت عین موت کے دروازے پر بھی اس کا ایک حصہ ظالموں کو پہنچتا ہے، موت کے بعد عالمِ برزخ میں بھی اس سے آدمی دوچار ہوتا ہے، اور پھر روزِ حشر سے تو اس کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا جو پھر کہیں جا کر ختم نہ ہوگا۔

[۵] یعنی یہ کوئی ہوائی باتیں نہیں ہیں جو اس قرآن میں کی جا رہی ہیں۔ اور نہ یہ کسی انسان کے قیاس و رائے پر مبنی ہیں بلکہ انہیں ایک حکیم و علیم ذات القا کر رہی ہے جو حکمت و دانائی اور علم و دانش میں کامل ہے، جسے اپنی خلق کے مصالح اور ان کے ماضی و حال اور مستقبل کا پورا علم ہے، اور جس کی حکمت بندوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے بہترین تدبیر اختیار کرتی ہے۔

[۶] یہ اُس وقت کا قصہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں آٹھ دس سال گزارنے کے بعد اپنے اہل و عیال کو ساتھ لیکر کوئی ٹھکانہ تلاش کرنے جا رہے تھے۔ مدین کا علاقہ خلیج عقبہ کے کنارے عرب اور جزیرہ نمائے سینا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ "مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے، میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا کوئی انگارا چُن لاتا ہوں تا کہ تم لوگ گرم ہو سکو۔"^ وہاں جو پہنچا تو ندا آئی^ کہ "مبارک ہے وہ جو اس آگ

کے سواحل پر واقع تھا۔ وہاں سے چل کر حضرت موسیٰ جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی حصے میں اُس مقام پر پہنچے جو اب کوہِ سینا کے نام سے مشہور ہے۔ اسی کے دامن میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔

یہاں جو قصہ بیان کیا جا رہا ہے اس کی تفصیلات اس سے پہلے سورۂ طٰہٰ (رکوع ۱) میں گزر چکی ہیں اور آگے سورۂ قصص (رکوع ۴) میں آ رہی ہیں۔

۹ فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رات کا وقت اور جاڑے کا موسم تھا۔ اور حضرت موسیٰ ایک اجنبی علاقے سے گزر رہے تھے جس سے انہیں کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ میں جا کر معلوم کرتا ہوں یہ کونسی بستی ہے جہاں آگ جل رہی ہے، آگے کدھر کدھر راستے جاتے ہیں اور کون کون سی بستیاں قریب ہیں۔ تاہم اگر وہ بھی ہماری ہی طرح کوئی چلتے پھرتے مسافر ہوئے جن سے کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں تو کم از کم میں کچھ انگارے ہی لے آؤں گا کہ تم لوگ آگ جلا کر کچھ گرمی حاصل کر سکو۔

۱۰ سورۂ قصص میں ہے کہ ندا ایک درخت سے آ رہی تھی، فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اس سے جو صورت معاملہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وادی کے کنارے ایک خطے میں آگ سی لگی ہوئی تھی مگر نہ کچھ جل رہا تھا نہ کوئی دھواں اٹھ رہا تھا اور اس آگ کے اندر ایک ہرا بھرا درخت کھڑا تھا جس پر سے یکایک یہ ندا آنی شروع ہوئی۔

یہ ایک عجیب معاملہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پیش آتا رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلی مرتبہ نبوت سے سرفراز کیے گئے تو غارِ حراء کی تنہائی میں یکایک ایک فرشتہ آیا اور اس نے اللہ کا پیغام پہنچانا شروع کر دیا۔ حضرت موسیٰ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی کہ ایک شخص سفر کرتا ہوا ایک جگہ ٹھیرا ہے، دُور سے آگ دیکھ کر راستہ پوچھنے یا انگارا چننے کی غرض سے آتا ہے اور یکلخت اللہ رب العالمین کی ہر قیاس و گمان سے بالا ذات اس سے مخاطب ہو جاتی ہے۔ ان مواقع پر ضرور کوئی ایسی غیر معمولی کیفیت خارج میں بھی اور انبیاء علیہم السلام کے نفس میں بھی ہوتی ہو گی جس کی

© rasailojaraid.com

ہیں ہے اور جو اس کے ماحول میں ہے۔ پاک ہے اللہ سب جہان والوں کا پروردگار۔[11] اے موسیٰ! یہ میں ہوں اللہ، زبردست اور دانا۔ اور پھینک تو ذرا اپنی لاٹھی "۔ جونہی کہ موسیٰ نے دیکھا لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے[12] تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا "۔ اے موسیٰ، ڈرو نہیں میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے[13] الا یہ کہ کسی نے قصور کیا ہو[14]۔ پھر اگر برائی کے بعد اس نے

بتا پڑا نہیں اس امر کا یقین حاصل ہو جاتا ہو گا کہ یہ کسی جن یا شیطان یا خود ان کے اپنے ذہن کا کوئی کرشمہ نہیں ہے، نہ ان کے حواس کوئی دھوکا کھا رہے ہیں، بلکہ فی الواقع یہ خداوند عالم یا اس کا فرشتہ ہی ہے جو ان سے ہمکلام ہے۔

[11] اس موقع پر "سبحان اللہ" ارشاد فرمانے سے دراصل حضرت موسیٰ کو اس بات پر متنبہ کرنا مقصود تھا کہ یہ معاملہ کمال درجہ تنزیہ کے ساتھ پیش آ رہا ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اللہ رب العالمین اس درخت پر بیٹھا ہو، یا اس میں حلول کر آیا ہو، یا اس کا نور مطلق تمہاری بینائی کے حدود میں سما گیا ہو، یا کوئی زبان کسی منہ میں حرکت کر کے یہاں کلام کر رہی ہو، بلکہ ان تمام محدودیتوں سے پاک اور منزّہ ہوتے ہوئے وہ بذاتِ خود تم سے مخاطب ہے۔

[12] سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء میں اس کے لیے ثُعبان (اژدہا) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہاں اسے "جان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسامت میں وہ اژدہا تھا، مگر اس کی حرکت کی تیزی ایک چھوٹے سانپ جیسی تھی۔ اسی مفہوم کو سورۂ طٰہٰ میں حَیَّۃٌ تَسْعٰی (دوڑتے ہوئے سانپ) کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

[13] یعنی میرے حضور اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ رسول کو کوئی گزند پہنچے۔ رسالت کے منصب عظیم پر مقرر کرنے کے لیے جب میں کسی کو اپنی پیشی میں بلاتا ہوں تو اس کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا ہوں۔ اس لیے خواہ کیسا ہی کوئی غیر معمولی معاملہ پیش آئے رسول کو بے خوف اور مطمئن رہنا چاہیے کہ اُس کے لیے وہ کسی طرح ضرر رساں نہ ہو گا۔

[14] یہ استثناء متصل بھی ہو سکتا ہے اور منقطع بھی۔ متصل ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ خوف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھلائی سے (اپنے فعل کو) بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں[15]۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں تو ڈالو، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ (دو نشانیاں)، نو نشانیوں میں سے ہیں فرعون اور اس کی قوم کی طرف (لے جانے کے لیے[16])، وہ بڑے بدکردار لوگ ہیں۔"

کی معقول وجہ اگر ہو سکتی ہے تو یہ کہ رسول سے کوئی قصور سرزد ہوا ہو۔ اور منقطع ہونے کی صورت میں مراد یہ ہوگی کہ میرے حضور تو کسی کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہے جب تک کہ آدمی قصوروار نہ ہو۔

[15] یعنی قصور کرنے والا بھی اگر توبہ کر کے اپنے رویے کی اصلاح کر لے اور برے عمل کے بجائے نیک عمل کرنے لگے تو میرے ہاں اس کے لیے عفو و درگزر کا دروازہ کھلا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ارشاد فرمانے سے مقصود ایک تنبیہ بھی تھی اور بشارت بھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نادانستگی میں ایک قبطی کو قتل کر کے مصر سے نکلے تھے۔ یہ ایک قصور تھا جس کی طرف لطیف اشارہ فرما دیا گیا۔ پھر جس وقت یہ قصور اچانک بلا ارادہ ان سے سرزد ہوا تھا اس کے بعد فوراً ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی تھی کہ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ (اے پروردگار، میں اپنے نفس پر ظلم کر گزرا، مجھے معاف فرما دے) اور اللہ تعالیٰ نے اسی وقت انہیں معاف بھی فرما دیا تھا۔ فَغَفَرَ لَہٗ (القصص، آیت ۱۶)۔ اب یہاں اسی معافی کی بشارت انہیں دی گئی ہے۔ گویا مطلب اس تقریر کا یہ ہوا کہ اے موسیٰ میرے حضور تمہارے لیے ڈرنے کی ایک وجہ تو ضرور ہو سکتی تھی، کیونکہ تم سے ایک قصور سرزد ہو گیا تھا، لیکن جب تم اس برائی کو بھلائی سے بدل چکے ہو تو میرے پاس تمہارے لیے اب مغفرت اور رحمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی سزا دینے کے لیے اس وقت میں نے تمہیں نہیں بلایا ہے بلکہ بڑے بڑے معجزات دے کر میں تمہیں ایک کارِ عظیم پر بھیجنے والا ہوں۔

[16] سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے کہ موسیٰ کو ہم نے صریح طور پر نظر آنے والی نو نشانیاں (تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ) عطا فرمائی تھیں۔ اور سورہ اعراف میں ان کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے (۱) لاٹھی جو اژدہا بن جاتی تھی۔ (۲) ہاتھ جو بغل سے سورج کی طرح چمکتا ہوا نکلتا تھا۔ (۳) جادوگروں کو برسر عام شکست دینا (۴) حضرت موسیٰ کے پیشگی اعلان کے مطابق سارے ملک میں قحط۔ (۵) طوفان (۶) ٹڈی دل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر جب ہماری کھلی کھلی نشانیاں ان لوگوں کے سامنے آئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔[۱۷] اب دیکھ لو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔ ع

(دوسری طرف) ہم نے داؤد و سلیمان کو علم عطا کیا۔[۱۸] اور انہوں نے کہا کہ شکر ہے اس خدا کا

---

(۷) تمام غلے کے ذخیروں میں سرسریاں اور انسان و حیوان سب میں جوئیں (۸) مینڈکوں کا طوفان (۹) اور خون۔

۱۷ قرآن میں دوسرے مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے مطابق کوئی بلائے عام مصر پر نازل ہوتی تھی تو فرعون حضرت موسیٰ سے کہتا تھا کہ تم اپنے خدا سے دعا کر کے اس بلا کو ٹلوا دو، پھر جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہم مان لیں گے۔ مگر جب وہ بلا ٹل جاتی تھی تو فرعون اپنی اُسی ہٹ دھرمی پر تُل جاتا تھا (الاعراف آیت ۱۳۴۔ الزخرف: آیت ۴۹۔۵۰)۔ بائیبل میں بھی اس کا ذکر موجود ہے (خروج باب ۸ تا ۱۰)۔ اور ویسے بھی یہ بات کسی طرح تصور میں نہ آسکتی تھی کہ ایک پورے ملک پر قحط اور طوفان اور ٹڈی دلوں کا ٹوٹ پڑنا اور مینڈکوں اور سرسریوں کے بے شمار لشکروں کا امنڈ آنا کسی جادو کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ یہ ایسے کھلے ہوئے معجزے تھے جن کو دیکھ کر ایک بے وقوف سے بے وقوف آدمی بھی یہ سمجھ سکتا تھا کہ پیغمبر کے کہنے پر ایسی ملک گیر بلاؤں کا آنا اور پھر اس کے کہنے پر ان کا دور ہو جانا صرف اللہ رب العالمین ہی کے تصرف کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ نے فرعون سے صاف کہہ دیا تھا کہ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، ”تو خوب جان چکا ہے کہ یہ نشانیاں مالک زمین و آسمان کے سوا کسی اور نے نازل نہیں کی ہیں“ (بنی اسرائیل، آیت ۱۰۲)۔ لیکن جس وجہ سے فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے جان بوجھ کر ان کا انکار کیا وہ یہ تھی کہ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ، ”کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے؟“ (المومنون، آیت ۴۷)

۱۸ یعنی حقیقت کا علم۔ اس بات کا علم کہ درحقیقت ان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے، جو کچھ ہے اللہ کا عطیہ ہے، اور اُس پر تصرف کرنے کے جو اختیارات بھی اُن کو بخشے گئے ہیں انہیں اللہ ہی کی مرضی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔[۱۹] اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا،[۲۰]

کے مطابق استعمال کیا جانا چاہیے، اور اس اختیار کے صحیح و غلط استعمال پر انہیں مالک حقیقی کے حضور جوابدہی کرنی ہے۔ یہ علم اُس جہالت کی ضد ہے جس میں فرعون مبتلا تھا۔ اس جہالت نے جو سیرت تعمیر کی تھی اس کا نمونہ اوپر مذکور ہوا۔ اب بتایا جاتا ہے کہ یہ علم کیسی سیرت کا نمونہ تیار کرتا ہے۔ بادشاہی، دولت، حشمت، طاقت دونوں طرف یکساں ہے۔ فرعون کو بھی یہ ملی تھی اور داؤد و سلیمان علیہما السلام کو بھی۔ لیکن جہالت اور علم کے فرق نے ان کے درمیان کتنا عظیم الشان فرق پیدا کر دیا۔

[۱۹] یعنی دوسرے مومن بندے بھی ایسے موجود تھے جن کو خلافت عطا کی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ ہماری کوئی ذاتی خوبی نہیں بلکہ محض اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس مملکت کی فرمانروائی کے لیے منتخب فرمایا۔

[۲۰] وراثت سے مراد مال و جائداد کی وراثت نہیں بلکہ نبوت اور خلافت میں حضرت داؤدؑ کی جانشینی ہے۔ مال و جائداد کی میراث اگر بالفرض تقسیم بھی ہوئی ہو تو وہ حضرت سلیمان کے لیے خاص نہ ہو سکتی تھی، کیونکہ حضرت داؤد کی دوسری اولاد بھی موجود تھی۔ اس لیے اس آیت کو اُس حدیث کی تردید میں پیش نہیں کیا جا سکتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ لا نورث ما ترکنا صدقۃ "ہم انبیاء کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے" (بخاری، کتاب فرض الخمس) اور ان النبی لا یورث انما میراثہ فی فقراء المسلمین والمساکین "نبی کا وارث کوئی نہیں ہوتا۔ جو کچھ وہ چھوڑتا ہے وہ مسلمانوں کے فقراء اور مساکین میں تقسیم کیا جاتا ہے" (مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیق حدیث ۶۰ و ۷۸)

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کا اصل عبرانی نام سولومون تھا جو "سلیم" کا ہم معنی ہے۔ ۹۶۵ قبل مسیح میں حضرت داؤد کے جانشین ہوئے اور ۹۲۶ ق م تک تقریباً ۴۰ سال فرمانروا رہے۔ ان کے حالات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم ص ۹۵-۹۷ اور حواشی سورۂ انبیاء رکوع ۶۔ ان کے حدودِ سلطنت کے متعلق ہمارے مفسرین نے بہت مبالغہ سے کام لیا ہے۔ وہ انہیں دنیا کے بہت بڑے حصے کا حکمران بتاتے ہیں، حالانکہ ان کی مملکت صرف موجودہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس نے کہا: "لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں[۲۱] اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں[۲۲] بے شک یہ (اللہ کا) نمایاں فضل ہے۔" سلیمان کے لیے جن اور انسان اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے[۲۳] اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ

فلسطین و شرق اردن پر مشتمل تھی اور شام کا ایک حصہ بھی اس میں شامل تھا۔ (ملاحظہ ہو نقشہ ملک سلیمان' تفہیم القرآن جلد دوم ص ۵۹۸)

۲۱۔ بائیبل اس ذکر سے خالی ہے کہ حضرت سلیمان کو پرندوں اور جانوروں کی بولیوں کا علم دیا گیا تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کی روایات میں اس کی صراحت موجود ہے (جیوش انسائکلوپیڈیا۔ جلد ۱۱، ص ۴۳۹)۔

۲۲۔ یعنی اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔ اسے لفظی معنوں میں لینا درست نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اللہ کے بخشے ہوئے مال و دولت اور ساز و سامان کی کثرت ہے۔ یہ بات حضرت سلیمان نے فخریہ نہیں فرمائی تھی بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی عطا و بخشش کا شکریہ ادا کرنا مقصود تھا۔

۲۳۔ بائیبل میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ جن حضرت سلیمان کے لشکروں میں شامل تھے اور وہ ان سے خدمت لیتے تھے۔ لیکن تلمود اور ربیوں کی روایات میں اس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے (جیوش انسائکلوپیڈیا ج ۱۱ ص ۴۴۰)۔ موجودہ زمانہ کے بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے کہ جن اور طیر سے مراد جنات اور پرندے نہیں ہیں بلکہ انسان ہی ہیں جو حضرت سلیمان کے لشکر میں مختلف کام کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جن سے مراد پہاڑی قبائل کے وہ لوگ ہیں جنہیں حضرت سلیمان نے مسخر کیا تھا اور وہ ان کے ہاں حیرت انگیز طاقت اور محنت کے کام کرتے تھے۔ اور طیر سے مراد گھوڑسواروں کے دستے ہیں جو پیدل دستوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تیزی سے نقل و حرکت کرتے تھے۔ لیکن یہ قرآن مجید میں تاویل کی بدترین مثالیں ہیں۔ قرآن یہاں جن، انس اور طیر، تین الگ الگ اقسام کے لشکر بیان کر رہا ہے اور تینوں پر الف لام تعریف جنس کے لیے لایا گیا ہے۔ اس لیے لامحالہ الجن اور الطیر، الانس میں شامل نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اس سے مختلف دو الگ اجناس ہی ہو سکتی ہیں۔ علاوہ بریں کوئی شخص جو عربی زبان سے ذرہ برابر بھی واقفیت رکھتا ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اس زبان میں محض لفظ الجن بول کر انسانوں کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچا تو ایک چیونٹی نے کہا "اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو"۲۲

کوئی گروہ، یا محض الطیر بول کر سواروں کا رسالہ کبھی مراد لیا جا سکتا ہے اور کوئی عرب ان الفاظ کو سن کر ان کے یہ معنی سمجھ سکتا ہے۔ محض محاورے میں کسی انسان کو اس کے فوق العادہ کام کی وجہ سے جن، یا کسی عورت کو اس کے حسن کی وجہ سے پری، اور کسی تیز رفتار آدمی کو پرندہ کہہ دینا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اب جن کے معنی طاقت ور آدمی اور پری کے معنی حسین عورت اور پرندے کے معنی تیز رفتار انسان کے ہو جائیں۔ ان الفاظ کے یہ معنی تو مجازی ہیں نہ کہ حقیقی اور کسی کلام میں کسی لفظ کو حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنوں میں صرف اسی وقت استعمال کیا جاتا ہے، اور سننے والے بھی ان کو مجازی معنوں میں صرف اسی وقت لے سکتے ہیں جبکہ آس پاس کوئی واضح قرینہ ایسا موجود ہو جو اس کے مجاز ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ یہاں آخر کونسا قرینہ پایا جاتا ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ جن اور طیر کے الفاظ اپنے حقیقی لغوی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں؟ بلکہ آگے ان دونوں گروہوں کے ایک ایک فرد کا جو حال اور کام بیان کیا گیا ہے وہ تو اس تاویل کے بالکل خلاف ہی ایک صریح قرینہ ہے۔ کسی شخص کا دل اگر قرآن کی بات پر یقین نہ کرنا چاہتا ہو تو اسے صاف کہنا چاہیے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا۔ لیکن یہ بڑی اخلاقی بزدلی اور علمی خیانت ہے کہ آدمی قرآن کے صاف صاف الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنے من مانے معنی پر ڈھالے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ قرآن کے بیان کو مانتا ہے۔ حالانکہ دراصل قرآن جو کچھ بیان کرتا ہے وہ اسے نہیں بلکہ خود اپنے زبردستی گھڑے ہوئے مفہوم کو مانتا ہے۔

۲۲ اس آیت کو بھی آج کل کے بعض مفسرین نے تاویل کے خراد پر چڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وادی النمل سے مراد چیونٹیوں کی وادی نہیں ہے بلکہ یہ ایک وادی کا نام ہے جو شام کے علاقے میں تھی اور نملة کے معنی ایک چیونٹی کے نہیں ہیں بلکہ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے۔ اس طرح وہ آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "جب حضرت سلیمان وادی النمل میں پہنچے تو ایک نملی نے کہا کہ اے قبیلۂ نمل کے لوگو۔۔۔"۔ لیکن یہ بھی ایسی تاویل ہے جس کا ساتھ قرآن کے الفاظ نہیں دیتے۔ اگر بالفرض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلیمان اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا ــــ "اے میرے رب، مجھے

وادی النمل کو اس وادی کا نام مان لیا جائے، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہاں بنی النمل نام کا کوئی قبیلہ رہتا تھا، تب بھی یہ بات عربی زبان کے استعمالات کے بالکل خلاف ہے کہ قبیلۂ نمل کے ایک فرد کو نملہ کہا جائے۔ اگرچہ جانوروں کے نام پر عرب کے بہت سے قبائل کے نام ہیں، مثلاً کلب، اسد وغیرہ۔ لیکن کوئی عرب قبیلۂ کلب کے کسی فرد کے متعلق قال کلب (ایک کتے نے یہ کہا) یا قبیلۂ اسد کے کسی شخص کے متعلق قال اسدٌ (ایک شیر نے کہا)، ہرگز نہیں بولے گا۔ اس لیے بنی النمل کے ایک فرد کے متعلق یہ کہنا کہ "قالت نملۃ" (ایک چیونٹی یہ بولی) قطعاً عربی محاورہ و استعمال کے خلاف ہے۔ پھر قبیلۂ نمل کے ایک فرد کا بنی النمل کو پکار کر یہ کہنا کہ "اے نملیو، اپنے گھروں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان کے لشکر تم کو کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو" بالکل بے معنی ہے۔ انسانوں کے کسی گروہ کو انسانوں کا کوئی لشکر بے خبری میں نہیں کچلا کرتا۔ اگر وہ حملے کی نیت سے آیا ہو تو گھروں میں گھسنا لاحاصل ہے۔ حملہ آور اس کے گھروں میں گھس کر اسے زیادہ اچھی طرح کچلیں گے۔ اور اگر وہ محض کوچ کرتا ہوا گزر رہا ہو تو اس کے پیٹ میں راستہ صاف چھوڑ دینا کافی ہے۔ کوچ کرنے والوں کی لپیٹ میں آکر انسانوں کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ چلتے ہوئے انسان بے خبری میں انسانوں کو کچل ڈالیں۔ لہٰذا اگر بنی النمل کوئی انسانی قبیلہ ہوتا اور اس کا کوئی فرد اپنے قبیلے کے لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا تو حملے کے خطرے کی صورت میں وہ کہتا کہ "اے نملیو، بھاگ چلو اور پہاڑوں میں پناہ لو تاکہ سلیمان کے لشکر تمہیں تباہ نہ کر دیں" اور حملے کا خطرہ نہ ہونے کی صورت میں وہ کہتا کہ "اے نملیو راستے سے ہٹ جاؤ تاکہ تم میں سے کوئی شخص سلیمان کے لشکروں کی جھپیٹ میں نہ آجائے۔"

یہ تو وہ غلطی ہے جو اس تاویل میں عربی زبان اور مضمونِ عبارت کے اعتبار سے ہے۔ رہی یہ بات کہ وادی النمل دراصل اس وادی کا نام تھا، اور وہاں بنی النمل نامی کوئی قبیلہ رہتا تھا، یہ محض ایک مفروضہ ہے جس کے لیے کوئی علمی ثبوت موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اسے وادی کا نام قرار دیا ہے انہوں نے خود یہ تصریح کی ہے کہ اسے چیونٹیوں کی کثرت کے باعث یہ نام دیا گیا تھا۔ قتادہ اور مقاتل کہتے ہیں،

© rasailojaraid.com